۴

''یورپی مرکزیت'' کا مسئلہ

ایم شاہد عالم

گوئٹے[۱] نے کہا تھا:

جو خود کو اور دوسروں کو جانتا ہے،
یہاں بھی دیکھے گا،
کہ مشرق و مغرب، بھائیوں کی طرح
کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے

دنیا کی کسی تہذیب میں خود تکریمی، خود ستائشی اور 'دوسروں' کو بدنام کرنے کا اتنا مادہ نہیں، جتنا کہ مغربی یورپ اور اس کے سمندر پار مقبوضات میں پایا جاتا ہے[۲]۔ یہ رجحان ۱۹ ویں صدی کے دوران اپنے عروج پر پہنچا، دوسری جنگ عظیم کے بعد مختصر عرصے کے لیے کم ہوا، لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے ایک مرتبہ پھر واپس آ رہا ہے۔

اب ناقدین متعدد دہائیوں سے 'یورپی مرکزیت' (Eurocentrism) کے عنوان تلے مغرب کے ان رجحانات پر تحقیق کر رہے ہیں، جس میں تصورات، رویوں اور پالیسیوں کے مجموعے کے ذریعے یورپ کو جغرافیائی، نسلی اور ثقافتی اکائی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، اور مغربی یورپ اور اس کے سمندر پار مقبوضات کو ۱۰۰۰ء سے اب تک کی عالمی تاریخ میں مرکزی حیثیت دی جاتی ہے۔[۳]

نسل پرستی کے مقابلے میں یورپی مرکزیت ایک نظریاتی منصوبے کی حیثیت سے ابھری، جسے یورپ کی دانشور اشرافیہ نے پالا پوسا تا کہ ۱۶ ویں صدی سے بڑھتی ہوئی یورپ کی توسیعی ریاستوں کے لیے خدمات انجام دے سکیں۔ 'یورپی مرکزیت' تمام شعبہ ہائے زندگی میں یورپ کی بالادستی کے بلند و بانگ دعوے کرتی ہے۔ اور یہ کہ عالمی نقطہ نظر سے صرف یورپیوں ہی نے گزشتہ تین ہزار سالوں میں تاریخ تخلیق کی، جس کا آغاز قدیم یونانیوں سے ہوتا ہے۔ مختلف لحاظ سے یہ مرکزیت نسل، ثقافت، مذہب اور جغرافیہ سے منسوب ہے۔

'یورپی مرکزیت' کا بنیادی نکتہ دنیا کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کرنا ہے: ہم اور وہ، خود اور دیگر۔ وہ تمام خوبیاں جو مغربی دانشوروں کے ذہن میں آئیں، وہ علامات ہیں یا بالادستی کے مصادر ہیں اور ان کو بڑے آرام سے 'ہم' کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس کے برخلاف جو کچھ ہو اس کا الزام 'دیگر' پر۔ تقسیم کے اس عمل میں یورپ کا تکبر و نخوت ناقابل یقین ہے۔

ایک مرتبہ تقسیم کی یہ لکیریں کھینچنے کے بعد تاریخ میں یورپ کی خیالی مرکزیت کو 'واضح' کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ بالاتر خصوصیات کا ایک فطری، غیر متغیر، بے مثال مجموعہ انسانی عزائم کے تمام شعبوں میں مغرب کی برتری کو شمار کرتا ہے، چاہے وہ اقتصادی ہوں یا ٹیکنالوجی، عسکری، سائنسی یا ثقافتی۔ یہ تاریخ میں بار ہا دہرایا جانے والا نفیس ترین بیانیہ ہے۔

تاریخ سازی

یورپی بالادستی کی تاریخ 'بیان' کرنے کے لیے یورپ کو ہر چیز کا مرکز قرار دینے والوں کو اپنی عظمت کی تاریخ مرتب کرنا پڑتی ہے۔ انہوں نے یونان اور روم کو اپنا کر 'یورپ' کی تاریخی گہرائی حاصل کی؛ اور اس کے لیے یورپ کو جغرافیائی، نسلی اور ثقافتی اکائی کی صورت میں پیش کیا۔ مزید برآں، وہ یونانی تہذیب کے مشرقی الاصل ہونے کی تردید کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ ابتدائی عیسائیت کے شام اور شمالی افریقہ سے روابط کو بھی نظر انداز کرتے ہیں۔ بلاد اسلامیہ کے مغربی یورپ پر احسانات کو پوشیدہ کرنے کے لیے انہوں نے ۱۱ ویں اور ۱۲ ویں صدی میں ہسپانیہ (Spain)،

صقلیہ (Cicily) اور مشرقی بحیرۂ روم (Levant) کے عربوں سے ہونے والے روابط اور اس کے نتیجے میں نئی ثقافتوں کے جنم لینے کی اہمیت کو بھی گھٹایا ہے[۴]۔ اس کے بجائے انہوں نے تاریخ کو چند صدیاں مزید پیچھے شمالی اٹلی تک پہنچایا، جہاں کی ثقافتی گلکاری — جسے حیات نو کا نام دیا گیا — کو یونانی فلسفے، علوم اور ادب کی 'براہِ راست' بحالی سے جوڑا۔

یورپی مرکزیت پسندوں نے ایک ایسی یورپی تاریخ بنائی جو یونان سے شروع ہوتی ہے، مغرب میں روم تک پہنچتی ہے، اور پھر مغربی یورپ میں دوبارہ مقام حاصل کرتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے نقطہ آغاز کی تلاش میں 'یورپی مرکزیوں' کو ان درمیان کی ۱۵ صدیوں کے بارے میں ذرا خجالت نہیں ہوتی جس دوران یونانی علوم اور فلسفہ جسے 'یورپ' نے بھلا ہی دیا تھا مشرق وسطیٰ میں پنپ رہا تھا۔

مغرب کے عروج کی تاریخ کو اپنے حق میں توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے علاوہ یورپی مرکزیت پسند اس امر سے بھی انکاری ہیں کہ باقی دنیا بھی کوئی تاریخ رکھتی ہے۔ جی ہاں، تہذیب کا آغاز مشرق سے ہوا، اور اس ابتدائی آغاز کے بعد ایشیا ماضی ہی میں جمود کا شکار ہو گیا، اور تاریخ کو آگے بڑھنے کے لیے مغرب کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا۔ ۱۹ویں صدی عیسوی کے یورپ کے سب سے اہم مفکر کارل مارکس نے بھی جامد ایشیائی معاشروں کا یہ افسانہ خریدا، جس کی خودسری نے انہیں تبدیلی کے محرک سے محروم کر دیا۔

گزشتہ چند دہائیوں میں 'یورپی مرکزیت' کو 'تاریخ گم کردہ افراد' (Peoples without history) کے علاوہ مغرب میں اختلاف رائے کے حامل دانشوروں اور سب سے زیادہ اہم نئے زمینی حقائق - مثلاً نئی آزاد خیال تحاریک کے ابھرنے - سے سخت چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جن میں مغربی نوآبادیاتی ریاستوں کے خاتمے، چین اور ویت نام کے اشتراکی انقلابات، انقلاب ایران اور سب سے بڑھ کر مشرق اور جنوبی ایشیا میں اقتصادی قوت کے متعدد مراکز کا ابھرنا شامل ہیں۔ اس چیلنج کے باوجود یورپی مرکزیت کی سوچ تقریباً تمام ہی مغربی معاشروں میں فکری مراکز (تھنک ٹینکس)، ذرائع ابلاغ، سیاسی مباحث اور عوامی تعصبات میں گہرا اثر رکھتی ہے۔ یورپی مرکزیت کے میلان کے وزن

اور رفتار کو صدیوں سے مغرب کے بہترین ذہنوں کی قوت حاصل رہی ہے، اسے چند دہائیوں میں اٹھا کر نہیں پھینکا جا سکتا۔

نقشہ جاتی ظلم

تاریخ کو مسخ کرنے کے Eurocentric تصور نے نقشہ جات کو بھی نہیں چھوڑا، یعنی نقشے بنانے کے 'علم' کو۔

یورپ، مشرق اور جنوب، ایشیا اور افریقہ، کے عظیم منطقہ ہائے زمین کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹا ہے۔ گو کہ یورپی مرکزیت پسند افراد یہ دلیل دے سکتے تھے کہ اپنے چھوٹے حجم کے باوجود یورپ نے اپنی مرکزی حیثیت کو برقرار رکھا، جو ایشیا اور افریقہ کے نسبتاً بڑے منطقہ زمین پر موجود ہونے کے باوجود ان پر یورپ کی خاصیتی برتری کا ثبوت ہے، لیکن انہوں نے اس کے برعکس انتخاب کیا۔ وہ نقشہ جات کے میدان میں پیش کردہ مواقع کو نظر انداز نہ کر سکے اور یوں نقشہ سازی کی قلمرو میں بھی ان کے غلبے کی علامات شامل ہوئیں۔

کہتے ہیں طاقتور کو سب سے اوپر ہونا چاہیے۔ یورپی مرکزیت نے مطالبہ کیا کہ نقشہ ساز یورپ کو دنیا میں اوپر دکھائیں۔ یہ کام کرۂ ارض کی سمت بندی کے ذریعے بآسانی کر لیا گیا یعنی شمال کو کرۂ ارض کے اوپر دکھا کر، یا نقشوں کی صورت میں صفحے کی اوپر کی جانب پیش کر کے۔ جب میں نقشے کا بالائی حصہ نیچے کی سمت کر کے اسے آویزاں کرتا ہوں، یعنی شمال کو نیچے کی جانب کرتے ہوئے، تو یہ بات میرے طلبہ کے لیے ہمیشہ باعث پریشانی رہی ہے۔ یہ بات برہم کرنے کے لیے کافی ہے کہ کوئی فطری تو کجا عام منطق بھی نہیں کہ شمال کو کرۂ ارض اور نقشوں میں اوپر کی جانب دکھایا جائے۔

دنیا کے نقشے ہر جگہ شمال کو اوپر کی جانب رکھ کر نہیں بنائے جاتے تھے۔ مسلمان اپنے عروج کے زمانے میں جب ان کی سلطنت ہسپانیہ سے خراسان اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی دنیا کے نقشوں میں جنوب کی سمت کو اوپر رکھ کر بنایا کرتے تھے، اس امر کے باوجود کہ دریائے نیل سے دریائے آمو تک پھیلے بلاد اسلامیہ سے اوپر افریقہ دکھائی دیتا تھا۔ شاید ان کی نظر میں نقشے کی سمت بندی اتنی اہم

نہیں تھی، کیونکہ بہرصورت وہ وسط ہی میں نظر آتے۔

مزید برآں، یورپیوں نے عالمی نقشہ سازی میں میرکاٹور (Mercator) کے استوائی نقشوں (Cylindrical Projection) کو بحیثیت سکہ رائج الوقت متعارف کروایا۔ کیا یہ ایک محض اتفاقی انتخاب تھا؟ یہ تسلیم کہ میرکاٹور نقشہ ملاحوں و جہاز رانوں کے لیے مفید ہے، کیونکہ ان نقشوں میں دو مقامات کو منسلک کرنے والی لکیر حقیقی سمت کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن کیا آپ یہ ماننے کو تیار ہیں کہ بحری جہازوں کے کپتان اپنے لیے موزوں نقشوں کو عام عوام کے لیے بھی مقرر کرنے میں دلچسپی اور اس کی قوت نافذہ بھی رکھتے تھے؟ جو بات زیادہ وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ یہ کہ میرکاٹور نقشوں کا انتخاب اس لیے کیا گیا کیونکہ یہ یورپ کے حجم کو کہیں بڑا کر کے دکھاتا ہے، افریقہ جتنا، بلکہ اس سے بھی بڑا، کر کے۔

مبالغہ آرائی یہ کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں چھپنے والے کچھ میرکاٹور نقشے تو نقشہ جاتی ظلم کر رہے ہیں۔ اپنے نقشہ جات میں امریکہ کو وسط میں دکھانے کے لیے ناشرین، ایشیا کو درمیان سے دو ٹکڑے کر کے لطف اندوز ہوئے، یعنی ایشیا کا نصف حصہ نقشے کے دائیں اور باقی بائیں جانب۔ اس بات کی اہمیت تو خیر کم ہی ہے کہ ایشیا کو دو نیم کرنے سے اس کاٹ چھانٹ شدہ نقشے کی نقشہ جاتی اہمیت کتنی کم ہوئی۔ یہ چیز یورپی مرکزیت کے پہلے حادثے اور حقیقت کو نظر انداز کرنے اور یورپ کو دنیا کے مرکز میں دکھانے کے لیے نظریہ علم پر تشدد کی خواہش کو بہت اچھی طرح بیان کرتی ہے۔

معیارات کو پلٹنا

جوانی کے ابتدائی ایام میں میں نے جانا کہ جہالت، تعصب کا بنیادی سبب ہے۔ تعصّبات، چاہے مذہبی ہوں یا نسلی، تعلیم اور علمی فضیلت کو گھٹا دیتے ہیں۔ اور میرے خیال میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تعصب کو جہالت سے تقویت ملتی ہے۔ عظیم دانش مندوں کو، اپنے وسیع مطالعے کی وجہ سے، طاقتور حلقوں کی طرف سے بُنے گئے جھوٹ کے جال کو صاف کرنے میں مشکلات کا سامنا کم ہی ہونا چاہیے۔ اس وقت یہ بات مجھے سمجھ نہیں آئی تھی کہ عظیم دماغوں کو بھی خریدا جاسکتا ہے، اور انہیں طاقت،

پیسے اور قبائلیت کی مختلف اقسام کے بہکاوے میں لایا جاسکتا ہے، بالخصوص اگر ان کی ثقافت نے انہیں ان چکنی چپڑی باتوں کے لیے تیار نہ کیا ہوتو۔

اپنے بھولپن اور سادگی، برداشت اور فہم وفراست کے درمیان تعلق، کو جاننے کے لیے مجھے مغربی دنیا سے مانوس ہونے میں چند سال ہی لگے۔ مغربی کلاسیکی ادب اور مغربی ذرائع ابلاغ سے آنکھیں چار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہوتا گیا کہ مغربی معاشروں کی رگوں میں اجتماعی سوچ اسلامی معاشروں سے بھی زیادہ دوڑتی ہے۔

مغربی مستشرقین کی کتب، اور بعد ازاں، مغرب کے عظیم ترین مفکرین — مونتیسکیو (Montesquieu)، کانت (Kant)، ہیگل (Hegel)، ملز (Mills)، مارکس (Marx)، ویبر (Weber)— کے مطالعے سے بڑھتی ہوئی آشنائی نے میرے نوجوانی کے مرتب کردہ معیارات کو پلٹ دیا۔ مغربی معاشروں کے تعصّبات کا مصدر بہترین مغربی دانشور ہیں- یہ تعصب عام نہیں۔ انہیں دانشمندانہ تاریخی روایات کے ذریعے معقول بنایا گیا، داستان گوئی کے ذریعے عظیم الشان حیثیت دی گئی۔ بلاشبہ معروف مفکرین نے ہی عام افراد کے تعصّبات کو پالا پوسا اور اس کو سہارا دیا۔

مجھے اب بھی مایوسی کا وہ لمحہ یاد ہے جب میں نے ول اور ایریل ڈیورنٹ کا گیارہ جلدوں کا جامع مجموعہ، ''تہذیب کی داستان'' (The Story of Civilization)، خریدا اور پھر معلوم ہوا کہ اس میں غیر یورپی تہذیبوں کے لیے گیارہ میں سے صرف ایک جلد وقف ہے۔ ذرا دیکھیے کہ اس جلد کا نام ہے ''ہمارا مشرقی ورثہ''۔ ڈیورنٹ کی داستان میں استشراقیوں نے تاریخ کے اسٹیج پر ابتداء یعنی انسانی تہذیب کے عہد طفلی میں مختصر سی حاضری دی، لیکن مغرب کے عظیم تہذیبی سفر کے آغاز کے ساتھ ہی وہ عالمی تاریخ کے منظرنامے سے عزت کے ساتھ غائب ہوگئے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ یہ عام سی ہی بات تھی، حتیٰ کہ جدید لکھاریوں کی نظر میں بھی۔

ایک اور کتاب جو میں نے اس کے چند سال بعد پڑھی، کینتھ کلارک کی ''Civilization'' یعنی تہذیب تھی، اپنے عنوان کے برعکس یہ کتاب بالخصوص مغربی یورپ کے فن، طرز تعمیر، فلسفے اور علوم

کے بارے میں ہے۔ کلارک نے ان تمام موضوعات پر بڑی کامیابی کے ساتھ گفتگو کی اور وہ بھی بھارت، چین، بلاد اسلامیہ، افریقہ اور براعظم امریکہ سے منسلک ہونے کا حوالہ دیے بغیر۔

مغربی فکر میں 'یورپی مرکزیت' کے تعصّبات سے آشنائی کے باوجود میں مغربی یورپ کے بہترین اور روشن ترین دماغوں میں بھی نسل پرستی کے نئے نمونوں پر اپنی مایوسی ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایمانوئیل کانت نے انسانوں کو چار 'نسلوں' میں تقسیم کیا، جنہیں 'فطری مزاج' کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'افریقہ کے نیگرو فطرتاً حقیر ہیں'۔ اس کی حمایت میں انہوں نے ڈیوڈ ہوم کے چیلنج کو دہرایا کہ صلاحیتوں کا حامل ایک 'نیگرو' دکھا دیں۔ سفید فاموں کی بیگمات کی جانب سے ایک 'نیگرو' بڑھئی کی آزادی کے استحصال کی شکایت پر کانت نے رائے دی کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مشاہدے میں کچھ سچائی ہو، پھر حد درجہ بغض و کینے کے ساتھ مزید انہوں نے کہا کہ 'مختصراً یہ کہ یہ بندہ کچھ زیادہ ہی کالا ہے، سر سے پیر تک، جو واضح ثبوت ہے کہ اس کی کہی گئی باتیں بے وقوفانہ تھیں'۔ کانت کے لیے نسلوں کا نظام مراتب واضح تھا۔ وہ زور دیتے ہیں کہ 'سفید فاموں کی نسل کی صورت میں انسانیت اپنے کمال کو پہنچی ہے۔ زرد ہندی ان سے کہیں نیچے ہیں اور سب سے نچلے درجے پر امریکی افراد ہیں'۔ ۵

یورپ کے چند نہایت قابلِ احترام مفکرین، بالخصوص ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی کے، یورپی مرکزیت کے دلفریب نغموں سے نکل سکتے تھے۔ چند مغربی مفکرین آج بھی مکروہیت کا سامنا نہیں کر سکتے۔ فرانسیسی فلسفی اور ماہر تحلیل نفسی اوکتاو مانونی (Octave Mannoni) جرأتمندی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ 'یورپی تہذیب اور اس کے بہترین نمائندگان نوآبادیاتی نسلی امتیاز کے ذمہ دار نہیں؛ یہ معمولی عہدیداران، چھوٹے تاجروں اور نوآبادکاروں کا کام ہے جنہوں نے بہت زیادہ کامیابیاں سمیٹے بغیر کافی محنت کی'۔ ۶ اشرافیہ کو چھوڑ دیں، نچلے درجے کی پرولتاریہ کو الزام دیں!

۱۹ویں صدی کے برطانیہ کے ایک مشعل راہ، جیمز مل، فلسفی و مؤرخ، نے پانچ جلدوں پر مشتمل ہندوستان کی تاریخ لکھی، جس کا واحد مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہندوستانی حکمران، علوم، فلسفے، ٹیکنالوجی

اورفنون میں کتنے نااہل یا کمزور ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہندوستانی وحشی ہیں اور وہ روشن خیال برطانوی سرپرستی ونگہبانی کے بغیر اپنے امور کو سنبھالنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ انکے صاحبزادے، جان اسٹورٹ مل، کہتے ہیں ''واضح الفاظ میں کہیں تو، دنیا کے عظیم ترین حصے کی کوئی تاریخ نہیں، کیونکہ رسوم وروایات کا غلبہ مکمل ہے۔ یہی معاملہ پورے مشرق کا ہے۔''[۷]

جیمز مل کے مقابلے میں ایک اور سائنس دان اور مؤرخ - ۱۱ویں صدی کے ایک افغان - البیرونی کا نظریہ کس قدر مختلف تھا، جنہوں نے ۱۳ سال ہندوستان کا سفر کیا، سنسکرت سیکھی، ریاضی پر سنسکرت کے کاموں کا ترجمہ کیا، پہلے ہندوستانی معاشرے کا خود جائزہ لیا، اور ہندوستانی دانشوروں کو غزنی مدعو کیا، تاکہ وہ ہندوستانی تہذیب پر اپنی دو جلدوں پر مشتمل کتاب کی تیاری کرسکیں۔ اپنی تحقیق کے مطابق ان کا ارادہ ہندوستان کے بارے میں مسلم قارئین کو جغرافیہ، مذاہب، علوم، ثقافت، فنون اور انداز واطوار پر مستند ترین معلومات فراہم کرنا تھا اور یوں ہندوستانی افراد کے بارے میں معلومات کے معیار کو بڑھانا تھا۔ انہوں نے اپنے رسالے کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کیا: ''اب ہم سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں پیش کردہ مواد ہندوؤں کے ساتھ واقفیت کے لیے اور مذہب، علوم وادب کے معاملے پر ان سے اپنی تہذیب کی بنیادوں کے مطابق گفتگو کے خواہاں کسی بھی فرد کے لیے مناسب ہوگا۔''[۸]

جدیدیت: مغربی کس طرح؟

۱۸ویں صدی میں یورپی مفکرین کی ایک مختصر تعداد انسانی معاملات میں منطق کی بالادستی کے لیے پرزور انداز میں کام کررہی تھی، انہیں معلوم تھا - اور بسا اوقات انہوں نے بخوشی تسلیم بھی کیا - کہ وہ کنفیوشس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جو ان سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ قبل موجود تھے۔

البتہ صدی کے اختتام پر ایک مضبوط تر اور زیادہ پراعتماد یورپ نے چینی یا یورپ سے باہر کسی اور مصدر کے ادھار کو بھلا دیا۔ انہوں نے، باصرار دعویٰ کرنا شروع کیا کہ منطق، سائنس اور جمہوریت یورپیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ مفکرین کی جانب سے ایک حیران کن دعویٰ تھا جن کا کہنا تھا کہ

معلومات کی بنیاد مشاہدے اور منطق پر ہونی چاہیے، اسے معروضی ہونا چاہیے۔

درحقیقت، یہ سوچنا مشکل ہے کہ ایک معاشرہ، بشمول جامد ترین معاشرے کے — کم از کم الہامی طور پر — سائنسی طریقے کی پیروی کیے بغیر اپنے ماحول میں کیسے موزونیت اختیار کر سکتا ہے۔ عملی معاملات میں تجربے سے مبرا معلومات معاشروں کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوں گی جو ہم سے کہیں زیادہ تواتر کے ساتھ زندگی کو خطرے سے دوچار کرنے والے حالات کی زد پر ہوں گے۔ مزید برآں، عرب سائنسدان بصریات، کیمیا اور فلکیات پر ہی سائنسی طریقے پر مشق نہیں کر رہے تھے بلکہ گیارہویں صدی کے اوائل میں ابن الہیثم، جسے یورپ Alhazen کے نام سے جانتا ہے، نے سائنسی طریق کار کی نظری کلیہ سازی پیش کی۔ سائنسی طریقۂ کار کے بانی کے طور پر معروف راجر بیکن نے ابن الہیثم کی کتاب ''کتاب المناظر'' کے لاطینی ترجمے کا مطالعہ کیا، اور اسے اپنی کتاب Perspectiva میں مختصراً بیان کر دیا۔

اگر افراد کا شمار جمہوریت کہلاتا ہے تو - بزعم خود جمہوریت کا قلعہ سمجھا جانے والا - ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی ۱۹۲۰ء تک نصف سے بھی کم افراد کا شمار کر رہا تھا، جب عورتوں کو ووٹ دینے کا اختیار دیا گیا۔ سیاہ فاموں کو ۱۹۶۵ء تک شامل نہیں کیا گیا۔ مجموعی طور پر تمام افراد کا شمار یورپ میں اقتصادی ترقی کی کئی صدیوں کے بعد آیا؛ یہ ان کی ترقی کی بنیاد نہیں تھی۔ تقریباً پورے ابتدائی جدید یورپ میں مطلق العنان بادشاہت مضبوط تھی اس کے بعد اسلامی معاشرے تھے، جن کے حکمرانوں کا قانون سازی پر محدود اختیار تھا اور، مزید برآں، قانونی محققین (فقہا) کے طبقے کے باضابطہ اختلاف کا سامنا بھی تھا۔ ۹ افریقہ اور ایشیا کے خانہ بدوش قبائل کا اپنا بزرگوں کا جرگہ ہوتا تھا، جس کی قیادت دانشمند کرتے تھے، اور گو کہ ان کے عقیدۂ مساوات انسانی میں عورت بسا اوقات شامل نہ ہوتی تھی، لیکن عموماً یہ یورپ کے طبقاتی معاشروں کے مقابلے میں آگے تھے۔ ہندوؤں کے پاس اپنی پنچایتوں میں خود مختار حکومتیں تھیں۔ پشتون کی پارلیمان لویہ جرگہ تھی۔ ابتدائی دور کے عرب ناقابل قبول نئے حکمران کے ہاتھ پر بیعت سے رک جاتے تھے۔

اگر جمہوریت کو اس کے جوہر ''برداشت'' پر بیان کیا جائے، یعنی مختلف مذاہب، رنگ، نسل اور چہروں مہروں کے فرق کا احترام کیا جائے تو روشن خیال ترین مفکرین نے بھی اس کا اطلاق صرف سفید فام نسل کے اراکین پر کیا ہے۔ برداشت واضح یورپی خصلت دکھائی نہیں دیتی۔ جدید زمانے میں، لیکن بالخصوص عہد روشن خیالی کے بعد، عیسائی عدم برداشت کی جگہ نسلی عدم برداشت نے لے لی جو بہت جلد نسل کشی کے منصوبوں یا براعظم امریکہ، افریقہ اور اوقیانوسیہ میں غلامی کی حمایت میں بدل گئی۔

عثمانیوں نے اپنے نظام ملت کے تحت — جو غیر مسلم مذہبی اقلیتوں کو زبردست خودمختاری دیتا تھا — تمام رعایا کے لیے کہیں زیادہ حفاظت فراہم کی۔ خاندانی معاملات کے متعلق قوانین نافذ کرتے ہوئے - جو بسا اوقات عیسائیت سے متاثرہ ہیں - جدید مغربی ریاستیں اسلامی حکومتوں کی برداشت کے برابر نہ ہوسکیں - جنہوں نے اپنے غیر مسلم عوام کو خاندانی معاملات میں ان کے مذہبی قوانین کے مطابق آزادی دی تھی۔ مغربی لکھاریوں کی جانب سے عالمگیر سطح پر ملامت کا موضوع مسلم ریاستوں کی جانب سے غیر مسلموں پر لگایا گیا وہ ٹیکس تھا جسے اکثر و بیشتر موخر الذکر کی جانب سے رعایت سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے وہ عسکری خدمات سے مستثنیٰ ہوجاتے تھے۔ جب مغربی قوتوں نے عثمانیوں پر عیسائی آبادی کے ساتھ 'برابری' کے سلوک کا دباؤ ڈالا تھا، وہ خود ہی متعدد عثمانی شہروں میں اس کے خلاف مظاہروں پر اتر آئے تھے۔

پندرہویں صدی کے اوائل میں پادریانہ مصالحت (Priestley intermediation) کا انکار عام طور پر جدیدیت کے لیے پہلی ضرب شمار کیا گیا: مبینہ طور پر اس نے یورپیوں کو خود بائبل پڑھنے اور خدا سے براہ راست رابطہ کرنے کی آزادی دی۔ اسلام نے اسے زیادہ بنیادی انداز میں حاصل کیا، وہ بھی ساتویں صدی کے اوائل میں؛ اور کون ہے جو یہ کہے کہ یورپی اس اسلامی نمونے سے واقف نہ تھے، یا پروٹسٹنٹ تحریک کے پیچھے اسلام سے متاثرہ کوئی ذہن نہ تھا؟[۱۰]

البتہ حیران کن طور پر روم کی ٹوٹ پھوٹ نے بھی عیسائیت کو قومیانے کے لیے آزاد کردیا، تا کہ مغربی یورپ میں نئی ابھرتی ہوئی ریاستوں کی جانب سے اسے اختیار کرلیا جائے، جنہوں نے قومی

گرجے اور عقائد کے قیام کا آغاز کیا، جس نے بعد ازاں مذہبی جنگوں، اذیت رسانی، نوآبادکاری اور غیر یورپی اقوام کو غلام بنانے کا جواز پیش کیا۔ بالفاظ دیگر، قبل از جدید دور کے مغرب میں ضمیر کی آزادی عموماً اسلامی معاشروں سے زیادہ محدود تھی، جہاں مذہبی قاعدے قوانین کو لاگو کرنے کے لیے کوئی ''گرجا'' موجود نہ تھا، اور مسلمان اپنی پسند کی قانونی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر رہ سکتے تھے۔

مروجہ معاشیات کے مرکزی خیال سے متاثر ہونا -یعنی ریاستی مداخلت کی بھرپور مخالفت- بنیادی طور پر چینی خیال تھا۔ اپنے وقت میں اس پالیسی — دی فزیوکریٹس (The Physiocrats) — کے فرانسیسی بانیوں میں سے ایک معروف شخصیت کو 'یورپی کنفیوشس' کہا جاتا تھا۔ فزیوکریٹک (قدرت شاہی) سیاسی معیشت کا خلاصہ بیان کرنے والا مخصوص لفظ، laissez faire، چینی جملے wu wei کا براہِ راست ترجمہ تھا۔[11] کلاسیکی اقتصادیات کا نام نہاد اینگلو سیکسن بانی ایڈم اسمتھ کیوسنے کا مرید تھا۔ چند قدیم ماہرین معاشیات جانتے ہیں کہ وہ جو زبان بولتے تھے — گو کہ بالارادہ نہیں لیکن — قدیم چینیوں کی ایجاد تھی۔

جب ۱۸ویں صدی میں یورپیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے ''مشین'' جدیدیت کا معیار ٹھہری، تو یہ جاننا دلچسپ ہوگا کہ کئی مشینیں جنہوں نے یورپ کی جدیدیت میں رہنمائی کی جیسا کہ ہوائی چکیاں (Wind Mills)، پن چکیاں، قطب نما، تکونا بادبان، اسطرلاب (Astrolabe)، کرۂ فلکی، گھڑیوں کی اندرونی میکانیکی ساخت، بیج بونے والی مشین، میکانیکی گھاس تراش اور بیجوں اور دانوں کو چھلکوں سے نکالنے والی مشین، آہنی ہل، چھاپہ خانہ، نل، پتوار، توپ اور بندوقیں اور کئی دیگر کی جنم بھومی مغربی یورپ سے باہر تھی، چین یا مسلم دنیا۔[12] اگر یہ یونان میں تخلیق پائیں، تو صدیوں تک انہیں مسلم دنیا میں بہتر سے بہترین بنایا جاتا رہا اور پھر مغربی یورپ کو دیا گیا۔

مغربی استعماریت کے بڑے حامیوں میں سے ایک روڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) اپنی انتہائی محدود سوچ میں مورچہ بند ہوئے، تصور نہ کر سکے کہ مشرق و مغرب کبھی مل پائیں گے۔

افسوس، یہ خبر ان تک نہ پہنچی کہ وہ مل چکے تھے کیونکہ مغرب زمانہ قدیم سے اس ملاپ سے فائدے سمیٹ رہا ہے۔

[ایم شاہد عالم بوسٹن، امریکہ میں نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب Israeli Exceptionalism: The Destabilizing Logic of Zionism (پالگریو میک ملن، نومبر ۲۰۰۹ء) ہے۔ یہ مقالہ ڈسیڈنٹ وائس ویب سائٹ (dissidentvoice.org) سے لیا گیا ہے۔]

(ترجمہ: فہد کیہر)

Source: Third World Resurgence No. 266/267, October/November 2012, pp 25-28

.....حواشی.....

1. Edgar A Bowring, *Poems of Goethe* (John W Parker & Son, 1853): 272.

2. EC Eze, *Race and the Enlightenment: A Reader* (Blackwell, 1997); M Shahid Alam, 'Articulating Group Differences: A Variety of Autocentrisms,' *Science and Society* (Summer 2003): 206-18.

3. For a review of this literature, see Andre Gunder Frank, 'East and West,' in: Arno Tausch and Peter Herrmann, eds., *The West, Europe and the Muslim World* (Novinka, 2006).

۴۔ ایک اسم کی حیثیت سے *Islamicate* (بلاد اسلامیہ یا مسلم دنیا) کا استعمال اس غلط فہمی کے خاتمے کے لیے کیا گیا ہے جو مسلمانوں کی دنیا کے بارے میں بات کرتے ہوئے لفظ 'اسلام' سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ 'یورپ اور اسلام' صفت کی حیثیت سے 'بلاد اسلامیہ' 'اسلامی' کی جگہ لیتا ہے؛ اول الذکر مسلمانوں کی سرگرمیوں اور افعال کے حوالے سے موخر الذکر سے مختلف ہے، جسے صرف اسی وقت استعمال کرنا چاہیے جب اسلام کے اصلی قواعد کا ذکر ہو۔

5. Eze, *Race and the Enlightenment:* 47, 55, 63.

6. Octave Mannoni, *Prospero and Caliban: Psychology of Colonization* (University of Michigan Press, 1990): 24.

7. John Stuart Mill, *Liberty* (NuVision, 1859): 60.

8. Alberuni, *Alberuni's India*, translated by Edward C Sachau, and abridged and edited by Ainslie T Embree (The Norton Library, 1971): 246.

9. Noah Feldman, *The Fall and Rise of the Islamic State* (Princeton University Press, 2008): 27-35.

10. Charles Lindholm, *The Islamic Middle East: An Historical Anthropology* (Blackwell, 1996): 13.

11. John M Hobson, *The Eastern Origins of Western Civilisation* (Cambridge University Press, 2004): 195-96.

12. Hobson, *The Eastern Origins:* Ch. 9.